ہٹا دیا۔ یہاں سے نظر آنے والا باغ کا حصہ بھی تراش خراش اور لے آؤٹ کی سے مکمل توجہ کا پتا دیتا تھا۔ صوفوں کے پہلو میں تپائی پر ایک بھاری ٹی کوزی کے نیچے ناکی چائے دانی گرمی سے پسینے میں نہائی ہوئی لگتی تھی۔ شوبھا نے حسبِ معمول بنائی۔

اور چائے کے آخری گھونٹ کے ساتھ ہی حسب معمول بیگم بابر اندر آگئیں ایسے آئیں جیسے ایک نابینا شخص احتیاط سے ہاتھوں سے دیکھتا ہوا اور آوازوں دھرے چلتا آتا ہے۔ وہ خاصی طویل قامت تھیں لیکن ان کی فربہی نے اُن کا قد چھ تھا۔ اُن کی رنگت بہت ستھری اور سفید تھی۔ عینک کا شیشہ اتنا دبیز تھا کہ اُن کی آنکھ بجائے صرف پتلیاں سی حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ ساڑھی ان کی جوانی میں فیشن ایبل لباس سمجھا جاتا تھا اور اب جب کہ یہ تقریباً متروک ہو رہی تھی بیگم بابر کسی اور پہناوے میں نہیں دیکھا گیا تھا۔

"بیٹھو مردان —" اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے تعظیم کے لیے اُٹھے مردان کو وہیں روک دیا اور مردان جانتا تھا کہ کس زاویے پر پہنچتے ہی بیگم بابر اُسے مردان" کہیں گی چنانچہ مردان بیٹھ گیا۔

بیگم بابر نے شوبھا کی طرف دیکھا جو سلام کرنے کے انتظار میں اپنی مسکراہٹ اختتام پر پہنچ رہی تھی۔

"مردان یہ تم نے بہت اچھا کیا بیٹے — مبارک ہو" اُنہوں نے شوبھا کی اُنگلی سیدھی کر کے اُسے مزید غور سے دیکھا۔

مردان فوراً جان گیا کہ آنٹی بابر حسبِ معمول بہک رہی ہیں، کچھ گمشدہ ہیر وہ پتہ نہیں کس کو کیا سمجھ رہی ہیں۔

"کس چیز کی مبارک دے رہی ہیں آنٹی؟"

"بھئی تم نے شادی جو کر لی — بہت اچھا کیا۔"

"یہ شوبھا ہے آنٹی — میری بیٹی۔"

"ہائے۔ ہائے" بیگم بابر نے سینے پر ماتم کرنے کے انداز میں ہتھیلی مارتے افسوس کا اظہار کیا۔ "بالکل ہے — میں اپنی بیٹی کو نہیں پہچانتی؟ ادھر آؤ بیٹی — مسکراتی ہوئی آگے آئی اور بیگم بابر سے سر پر ایک تھپکی پیار وصول کر کے واپس ہو گئی

بیگم بابر قطعی طور پر مخبوط الحواس نہیں تھیں.. وہ حواس میں تھیں لیکن اُن کے حواس پر ان کی عمر کے پچھتر برس اور کچھ واقعات اثرانداز ہوئے تھے۔ وہ بھول جاتی تھیں... فارگٹ فل تھیں — مخبوط الحواس نہیں تھیں۔

"میں نے سُنا تھا کہ تم لاہور گئے تھے۔ کب آئے اور شوبھا کو اُس کھٹارہ بیرک میں بند کر کے کیوں چلے گئے — ہمارے ہاں چھوڑ جاتا تھا — شادی تو غالباً تم نے ابھی نہیں کی؟"

"نہیں جی —"

شوبھا ذرا آگے ہو کر بولی اور ذرا سرگوشی میں بولی "بابا میرا خیال ہے کہ آنٹی بابر سے مل کر میں ایک کنسپریسی کروں اور آپ کی شادی کر دی جائے —"

"اِس ملک میں مزید کنسپریسیوں کی گنجائش نہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"ہنستے کیوں ہو مردان؟" آنٹی بابر نے فوراً دریافت کیا اور پھر شوبھا کی جانب متوجہ ہو گئیں "میرا خیال ہے تم نے اِسے کچھ کہا ہے؟"

"جی آنٹی — میں بھی اس خیال کی حامی ہوں کہ بابا کی اب شادی ہو جانی چاہیے۔"

"ہائیں اس کی شادی نہیں ہوئی؟" بیگم بابر بہت فکرمند سنجیدگی کے ساتھ کہنے لیں "تو پھر یہ بیٹی کہاں سے آ گئی —"

"یہ بیٹی —" مردان نے ایک ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا "یہ پتہ نہیں کہاں سے آ گئی..."

بیگم بابر نے اُن سے چائے کے بارے میں دریافت کیا کہ گرم تھی یا کہ نہیں، مردان سے پوچھا کہ اُس کا سکول کب کھل رہا ہے۔ پھر "لڑکیوں" کے بارے میں باتیں کرنے لگیں، ایک مرتبہ پھر اُن کو شک ہوا کہ مردان نے شادی کر لی ہے اور اُن کو بتایا تک نہیں، پھر وہ کافی دیر تک شوبھا کی شادی کے حوالے سے فکرمند رہیں اور پھر "میں ذرا لیٹ لوں" کہہ کر فوری طور پر سو گئیں۔ اُسی کرسی پر اور اُسی حالت میں — صرف اُن کے بلند آہنگ خراٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہیں۔

بیگم بابر دن یا رات کے کسی بھی وقت صرف تیس سیکنڈ کے اندر اندر کسی بھی مدت کے لیے سو سکتی تھیں۔ یہ اُن کا کمال تھا... نیند اُن کی بندی تھی۔ مردان نے

اُن کی جانب دیکھا — وہ اُس روز بھی اسی طرح سو رہی تھیں... چند سرخ دھبے سفید ساڑھی پر تھے ورنہ وہ اِسی طرح سو رہی تھیں۔

شوبھا بھی اُن کو دیکھ رہی تھی — یہ حواس باختہ سی عورت کیا اُسے ماؤں سے کر محبوب رکھتی ہے یا عینک کے دیوار شیشوں کے پیچھے جو آنکھیں روپوش ہیں اُن میں کے لیے ایک ناپسندیدگی ہے جو نفرت کو اپنے دماغ سے دھکیلنے کی کوشش میں جز ہے... اُن آنکھوں میں سب کچھ ہے جو اُنہوں نے دیکھا ہوا ہے لیکن سرے کا پتہ چلتا، گنجل بہت ہیں، کہاں سے آغاز ہوا تھا اور اختتام کا دھاگہ کدھر کو جا رہا ہے۔ دھاگہ انیس برس کی مسافت طے کرنے کے باوجود پہلے دن کی طرح پکا پیڈا ہے یا اس تار بوسیدہ ہو کر الگ ہونے کو ہیں؟.... یہ سب کچھ دیوار شیشوں کے پیچھے تھا اور وہاں خرانوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ایک آہٹ ہوئی اوپر پہلی منزل کی لینڈنگ پر اور شوبھا نے متوقع نظروں سے دیکھا... وہاں دونوں "لڑکیاں" کھڑی تھیں۔ اُنہوں نے بہت آہستگی سے ہاتھ ہلا کر شو خوش آمدید کہا، اتنی آہستگی سے جیسے خواب میں ہوں اور پھر وہ زینے سے اُترنے لگیں نازنین بابر زری کے سرخ رنگ کے چست پاجامے اور ٹشو کے گولڈن کرتے میں، میں سلیم شاہی جوتی اور سرخ دوپٹہ جو اُس کے پیچھے زینہ زینہ گھسٹتا آ رہا تھا۔ عارفہ اُس کے برابر میں تھی، ٹشو کے بڑے گھیر والے غرارے اور دبکے کے کام والے میں — وہ نازی سپاہیوں کی طرح ایک تواتر اور تسلسل کے ساتھ قدم ملاتی نیچے آ تھیں۔

مردان کے کانوں میں اُن کے قدموں کی چاپ آ رہی تھی اور قریب آ رہی وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اُس نے ہمیشہ اُن کی جانب دیکھنے سے اجتناب کیا اور جب غیر ارادی طور پر اُس کی نظر اُن پر گئی تو اُس کے کانوں کی لویں گرم ہو جاتیں اور ایک احساسِ شرمندگی سے اس کا پورا بدن پسینے سے بھیگنے لگتا۔ اُنہوں نے جو کچھ بھی زیب کیا ہوتا وہ اُسے کبھی نظر نہ آتا...

وہ دونوں اُس کی عمر کے آس پاس ہی تھیں لیکن وقت کی ہوا نے اُن کے کو بہت اتھل پتھل کیا تھا اس کے باوجود کہ وہ ہمیشہ اونچی چھتوں والی وسیع رہائش میں "محفوظ" پڑی رہیں۔ جیسے نوکری میں دیر تک پڑے رہنے والے سیب پر بھی جھ

جاتی ہیں۔

ان دونوں نے باری باری شوبھا کے آگے اپنے گال کیے اور اُن پر بوسے وصول کر کے جواب میں اُسے بھی چوما۔

مردان نظریں جھکائے بیٹھا رہا اور عارفین کے "کیسے ہو مردان؟" کے جواب میں وہ غیر واضح الفاظ میں کچھ بڑبڑایا۔

شوبھا کے رُخسار پر عارفین کی شاکنگ پنک لپ سٹک کا نشان صرف اس وقت دکھائی دیتا جب وہ گردن گھما کر مردان کی جانب دیکھتی... اور فانوس کے دوسرے بلب کی روشنی کی زد میں آ جاتی۔

بوڑھی ہڈیوں کی تھکاوٹ کا سرور، ایک بے مقصد زندگی کی اکتاہٹ بھری نیند، اور اس نیند میں لڑکیوں کی آوازیں، پھر اونگھنا، پھر مشکل سے آنکھیں کھول کر موٹے شیشوں کے پار کچھ ہیولے دیکھنا... بیگم بابر نہ نیند میں تھیں نہ بیدار تھیں... وہ کچھ بھی نہ تھیں، لیکن اب بھی انہیں دوسری منزل کے سٹورز میں پیک کیے ہوئے ڈنر سیٹس، ڈیپ فریزرز، فرنیچر، ملبوسات، قالینوں، ڈریسنگ گاؤنز، طوطوں کے لیے چاندی کے پنجروں اور اُن سینکڑوں اشیاء کی ایک ایک تفصیل یاد تھی جو عارفین کے لیے تھے اور تیسری منزل کے سٹور میں ہر اُس شے کی ڈپلیکیٹ تھی جو دوسری منزل کے سٹور میں موجود تھی، یہ سب کچھ نازنین کے لیے تھا۔ بہار کے پہلے دنوں میں یہ تمام سامان باہر نکالا جاتا، اس کی ڈسٹنگ کر کے دوبارہ پیک کیا جاتا اور کارٹنز پر نمبر لگا کر اُن کی فہرست بنا کر پھر سے سٹور کر دیا جاتا۔ اس لمحے میں جب وہ نیند میں نہیں تھیں، بیدار نہیں تھیں.. وہ اپنے ذہن کے کینوس پر کسی ایک ڈنر سیٹ کی کوائر پلیٹ پر بنے ہوئے کسی ایک پھول کی پتی کی تفصیل پینٹ کر سکتی تھیں۔ کٹلری کے فلاں سیٹ میں سوئیس کے لیے جو چمچے ہیں اُن کی شیپ کیا ہے اور فلاں رنگ کی رضائی میں کتنے سیر روئی ہے — یہ سب کچھ نقش تھا — اور یہ جو مردان ہے، نظر تو آ رہا ہے لیکن.... یہ اب بھی عارفین کے سامنے نظر جھکا کر بات کرتا ہے، اِس کی طرف دیکھتا نہیں.... جواری جب سب کچھ ہار جاتا ہے تو ایک ناممکن خیال اُسے بار بار ستاتا ہے.... اگر وقت ذرا پیچھے چلا جائے صرف اُس لمحے تک جب میں جوئے کی میز پر بیٹھنے والا تھا اور اُس وقت میرے پاس سب کچھ تھا... دولت، گھر، زمینیں، عزت نفس... تو میں اس میز پر نہ بیٹھوں اور یہ سب کچھ اب بھی میرے پاس ہو — نہیں اگر

وقت پیچھے چلا جائے تو بھی حیات کے اس جوئے کا End Result یہی ہونا تھا... وہ مردا
کیسے قبول کر لیتیں، ایک معمولی کپتان کو جو کوئی بھی میڈیا کر لڑکا ہو سکتا تھا اور وہاں تو
ہی میڈیا کرز کو کیا جاتا تھا... عارفین اُس کے لیے بہت بلند اور بہت پرے تھی... شاید
ہتھیار ڈال دیتیں اگر عارفین کی باگیں عشق بہت تناؤ میں رکھتا اور اُس کے نتھنے چر
آتے اور وہ اُس کی الفت میں بہت ہی مبتلا ہو جاتی... پر ایسا نہیں تھا، وہ کوسے گرم پا
طرح تھی، مردان نہ تو اُس کے احساسات کو برانگیختہ کرتا تھا اور نہ ہی مکمل طور پر
چھوڑتا تھا... حیات کے اس جوئے کا نتیجہ یہی نکلنا تھا.. ہاں مردان نظر تو آ رہا ہے اور یہ
بھی عارفین کے سامنے نظر جھکا کر بات کرتا ہے۔ یقیناً اسے خیال ہے کہ میں سو چکی
اور میرے خراٹے اس بات کی دلیل ہیں لیکن خراٹے تو میں خود بھی سن رہی ہوں... لا
اینڈ کلیئر.... اور اس کا خیال ہے کہ میں نے اُس روز اسے کھڑکی میں سے اندر آتے
دیکھا تھا....

عارفین ننگی پڑی تھی۔
اُس کی ٹانگیں کھُلی ہوئی تھیں ان کے اوپر چھوٹا سا سبز پرچم پڑا ہوا تھا۔ گاڑھا اور گہرے
رنگ کا خون جو چاند تارے کی سفیدی میں سرایت کر رہا تھا، عام خون نہ تھا...
مردان اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ اس کی پہچان چہرے کی محتاج تھی... اور یہ
ایک اجنبی بدن تھا۔ وہ ذرا آگے ہوا، جھکا، چہرے کو دیکھا اور پیچھے ہو گیا۔

ظہیر الدین بابر کا گھر مرجع خلائق تھا۔ نوجوان فوجی افسر اپنے اپنے چکوال، گجرات
اور صوابی سے دور ایک ہوسٹائل انوائرمنٹ میں غیر محفوظ محسوس کرتے ہوئے
مکھیوں کی طرح آتے تھے۔ اور وہاں اُنہیں چائے کے ساتھ ہمدردی ملتی تھی جو اداسی
توڑ تھی۔ اور وہاں لڑکیوں کی آوازیں تھیں اور اُن کی خوش گفتاری میں کانونٹ کے دن
مٹھی میں بھر لینے والے لہجے تھے۔ بیگم بابر تھیں جو ہر لڑکے کا نام ہر پانچ منٹ کے
پوچھتیں اور پھر "یو آر ویلکم لیڈ" کہتیں۔ بابر سول سروس کے آخری برسوں میں تھے
جیسور کی پوسٹنگ کو "لف پوسٹنگ" کے طور پر برداشت کر رہے تھے۔ ان کا آرکیٹیک

وزانہ کراچی سے کال کر کے اُن سے اُن کی زیرِ تعمیر کوٹھی کے باتھ رومز کی ڈائمنشنز کے
ے میں دریافت کرتا۔ ظاہر ہے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے کراچی میں سَیٹل ہونا تھا کہ
تہذیب یافتہ رویہ تھا۔ سروسز میں وہ مشرقی پاکستان کے کوٹہ میں سے آئے تھے صرف
لیے کہ Natives اتنے بریلینٹ نہیں تھے ذرا ڈل وِٹڈ تھے اور بابر بہاری ہونے کے
ود اپنے سبارڈی نیٹس سے باقاعدہ بنگالی میں "تو می کیمون آچھو" پوچھ سکتے تھے۔ اس
علاوہ وہ نہایت انکساری سے کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی زبان کو بنگالی ماحول کے باوجود
دہ نہیں ہونے دیا۔ مردان اپنے فیلو آفیسر کیپٹن گل ریز کے ہمراہ جھجکتے ہوئے ایک بار
بابر کی رہائش گاہ پر آیا اور پھر ریگولر ہو گیا۔

باہر بہت بدامنی تھی لیکن آنٹی بابر کے گھر سکھ چین تھا اور ایک چھوٹا سا مغربی
ان آباد تھا... نوجوان افسروں کے چہرے باتیں کرتے کرتے سرخ ہو جاتے، اُن میں سے
یک عارفین یا نازنین یا دونوں پر فدا تھا۔ گھر سے دور وہ اُن کی جانب دیکھتے تو اُن کی
یں ڈبڈبانے لگتیں۔ وہ "آرڈر آف دی ڈے" ڈسکس کرتے لیکن اُن کی نظریں ادھر
اٹھتی رہتیں... یار تم امیجن نہیں کر سکتے کہ کرنل خان نے آج کیا کہا... اُس نے کہا
شرقی پاکستان کی پرابلم صرف ہندو ہے۔ ایلیمینیٹ دے باسٹرڈ اینڈ — نو پرابلم... یو نو
خان صرف پچھلے ہفتے ڈھاکہ پہنچے تو آفٹرنون میں انہوں نے شہر کا ایک راؤنڈ کیا۔
پر انہوں نے کہا کہ یارا ادھر تو میں جدھر گیا ادھر ہندو مندو ہے۔ دھوتی موتی میں
را میں نے ایک برسٹ سے چار پانچ ہندو مندو مار دیا — تو ادھر میس میں ایک نٹ
" وہ کہنے لگا، کرنل صاحب ادھر سب مسلمان ہے اور جن کو آپ نے برسٹ مارا ہے
شاید مسلمان تھے تو کرنل بہت ہنسا... کہنے لگا دیکھو میجر، کرنل خان کے سامنے اگر کوئی
ے موافق دھوتی موتی پہن کر پھرے گا تو یارا بس ہندو مندو ہو گا ==

پہلے روز جب مردان کیپٹن گل ریز کے ہمراہ آنٹی بابر کے ہاں آیا تو تازہ ترین
ر آف دی ڈے" زیرِ بحث تھا۔

"سر یہ تو اسلام کا مسئلہ ہے۔ قرآن میں آیا ہے مشرک کافر تمہارے دوست
و سکتے سر... میں سمجھتا ہوں کہ یہ آرڈر آف دی ڈے ذرا دیر سے آیا ہے۔ آئی
سر کہ اوپر انتظامیہ میں جو لوگ ہیں وہ محبِ وطن نہیں ہیں سر... سر ہمیں آپ لبرٹی
بنگال پرابلم اِن نو ٹائم سالو ہو جائے سر... دے آر کاورڈز سر... اونلی اِنڈیا مائنڈ یو..."

"لیکن لیفٹیننٹ... پرابلم تو ہے... اب حکم یہ ہے کہ جدھر سے کانوائے ادھر راستے میں جتنے گاؤں ہیں تو اُن میں جو ہندو گھر ہیں اُن کو... جلا دیا جائے لوگ... لیکن لیفٹیننٹ... ادھر بنگال میں جو باسٹرڈ ہیں وہ سب ایک جیسے گھروں ہیں... کیسے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہندو گھر ہے.. اور یہ مسلمان؟"

"ایمان کا جذبہ ہونا چاہئے سر... پتہ چل جاتا ہے۔ مومن کی تلوار کبھی نہیں اُٹھ سکتی۔"

اس بیان پر تمام حاضرین نے نوجوان لیفٹیننٹ کی جانب ستائش بھری نظر دیکھا اور نوجوان لیفٹیننٹ نے عارفین اور نازنین کی جانب دیکھا جو اِک شانِ سے اُس کی طرف متوجہ تھیں...

چنانچہ ظہیر الدین بابر کا گھر مرجع خلائق تھا۔

باہر بدامنی بہت تھی۔

بنیادی مقصد یہی تھا کہ وہ سب ایک جیسے گھروں میں رہتے تھے، دھوتی تھے اور ٹھنی کے موافق پتلے دُبلے تھے۔ بہرحال آرڈر کے مطابق اُنہوں نے پڑتے چند دیہات کو نذرِ آتش کرنا تھا۔

"سر یہ جو کر اپنے گھاس پھونس سے بنائے ہوئے جھونپڑوں کو گھر کہتے ٹیل یو سر میں نے ان کے گھروں میں ہارمونیم دیکھے ہیں.. اور ان کی لڑکیاں ڈانس سر.. میں نے خود دیکھا ہے تو پھر ہاؤ کین دے بی مسلمز... سر آئی کین سویئر کہ ہندو ہے سر... آئی کین فیل اِٹ سر..."

بارش بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی اس لیے آگ لگانے میں آ ننگ دھڑنگ اور کالے شاہ بچے چیونٹوں کی طرح جلتے جھونپڑوں میں سے نکلتے... اور اُن کی مائیں جن کے پیٹ ننگے تھے اور جو ایک نامانوس زبان میں کچھ اُن کے سامنے آتیں تو وہ اُن کی چھاتیوں کی طرف متوجہ ہو جاتے...

کیپٹن مردان خان راؤنڈ لگانے کے بعد اپنے یونٹ کو واپس آ رہا جانب جہاں جنگل کا اختتام ہوا تھا ایک تالاب کے کنارے جھاڑیوں میں کچھ — اُس کے جوان چوکنے ہو گئے اور جیپوں سے اُتر کر اُن جھاڑیوں میں رسیدہ پتوں کی طرح لرزتے زرد چہروں والے دھوتی پوش تین منحنی سے

ے...

"مکتی باہنی سَر —" صوبیدار اللہ یار نے شن ہو کر کہا۔

اُس کے جوانوں نے ہتھیاروں کی نالیاں سیدھی کر لیں —

"آر یُو شُور؟" مردان نے پوچھا۔

"آہو جی — ان مردودوں کی شکل سے پتہ چل جاتا ہے — شوُٹ کر دوں

...؟"

"چیک کر لو یار —"

"کرتا ہوں سَر —" صوبیدار اللہ یار نے تین مختصر جھٹکوں سے اُن تینوں کی
دھوتیاں اُتار دیں.. وہ منحنی چوہوں کی طرح ڈرنے لگے اور سکڑنے لگے..

"ہاں صوبیدار صاحب —" مردان کچھ فاصلے پر تھا اور جیپ سے نیچے اُترنے کا
رسک نہیں لینا چاہتا تھا "چیک کر لیا —"

"سَر —" صوبیدار نے ان تینوں کے درمیان کو ذرا غور سے جھُک کر دیکھا "سَر
، پتہ نہیں چل رہا۔ اِن ماں یاؤں کا کچھ پتہ نہیں چلتا —"

"جلدی کرو — ادھر ایمبوش نہ ہو جائے —"

"سَر اِن کی بہت سکڑی ہوئی ہیں۔ کچھ معلوم نہیں پڑتا کہ کٹی ہوئی ہیں یا اصلی
حالت میں ہیں..."

"اِن باسٹرڈز سے پوچھو یار کہ کیا ہیں..."

"یہ ماں یائے نہ اردو بولتے ہیں سَر... ہماری قومی زبان اور... پتہ نہیں کیا بولتے
. لیکن سر کلمہ پڑھتے ہیں بار بار —"

"کلمہ تو ادھر سارے ہندو بھی پڑھ سکتے ہیں سَر —" ایک لیفٹیننٹ نے اپنا تجربہ
بیان کیا "دے آر مُکتی باہنی سَر —"

"شوٹ دیم —"

یونٹ میں پہنچتے ہی اُسے بہت ساری خبریں ملیں۔ مُکتی باہنی نے بہاری آبادی کو ملیا
میٹ کر دیا تھا۔

صبح کے دس بجے تھے لیکن آنٹی بابر کے وسیع بنگلے میں خاموشی تھی۔ ملازم غائب
اور کتوں کا راتب پڑا تھا۔ زنجیریں موجود تھیں لیکن وہ نہیں تھے۔ مردان

دروازوں کو دھکیلا۔ وہ اندر سے بند تھے۔ وہ ایک کھڑکی کے پٹ کھول کر اندر کود گ
آنٹی بابر ایک راکنگ چیئر میں — اپنی پسندیدہ سفید ساڑھی میں — اور
نتھنوں میں سے خراٹوں کی گہری آواز — آنکھوں پر دیوار شیشوں کی عینک —
کی سفیدی پر کہیں کہیں سُرخ دھبے تھے۔ وہ سوئی ہوئی تھیں — بس اسی طرح جیہ
ہیں۔

وہ دوسرے کمرے میں گیا — بابر صاحب کی سٹڈی میں — اُن کے دونو
اور دونوں ٹانگیں الگ الگ — بک شیلف میں کسی ورک آف آرٹ کی طرح۔
— ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر کے برابر میں ایک بازو — دس
زرتشترا کے قریب دوسرا ہاتھ... ایک ٹانگ بالکل پرفیکٹ حالت میں فسانۂ آزاد۔
اور دوسری دیوانِ غالب کے صفحات پر — اُن کا دھڑ سٹڈی ٹیبل پر کسی صدارتی
میں ڈائننگ ٹیبل پر سجے سالم بکرے کی مانند تھا — جس نے بھی انہیں کاٹا تھا نہایت
سے کاٹا تھا — کہیں کوئی دھاگہ یا تار لٹکتا نہیں تھا —

اور اُس لونگ روم کی پوری دیوار کی شیشہ کھڑکی میں سے بوڑھی گنگا کی
اور ویرانی نظر آتی تھی وہاں عارفین ننگی پڑی تھی۔

ایک سبز پرچم جہاں سے آدم جنم لیتا ہے۔

عارفین کی چھاتیاں جن پر "جئے بنگلہ" پینٹ کیا گیا تھا۔ جئے کا ایک نقطہ اور
دوسرا نقطہ پینٹ کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اُبھاروں کے اختتام پر نپل یوں
ہو رہے تھے۔ اُس کی باچھوں سے خون کی لکیریں گردن تک آتی تھیں اور جم جاتی
عارفین کا سانس چلتا تھا، کیونکہ پرچم ہولے ہولے اوپر نیچے ہوتا تھا۔

نازنین باتھ روم میں پڑی تھی۔ ٹب کے اندر — اور اُسے بھی حب
جذبے سے سرشار کر دیا گیا تھا۔ ایک سبز پرچم لیکن چاند ستارے کو سُرخ کرتا ہوا
اپنا تھا۔

مردان سنک کے اوپر دوہرا ہو گیا اور قے کرنے لگا۔

باسٹرڈز باسٹرڈز —

نسان پٹرول کا شیشہ ایک ہموار آہستگی سے نیچے آنے لگا اور اُس کے اندر جو ایک
ن اور گرم آسودگی تھی اُس میں اُسی آہستگی سے سرد، کٹیلی اور منتظر ہوا کی یخ بستگی
ل ہونے لگی۔ گندے مندے، غلیظ ناخنوں والے ٹھٹھرتے سفید اور سردی سے نچڑے
ئے متعدد چھوٹے چھوٹے ہاتھ بھی اندر آئے جو جنگلی نرگس کے پھولوں کو اُس کی ناک
آگے ہلانے لگے —

اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ نرگس کی مہک میں جو بہت سرد سندیسہ تھا وہ اُس
اندر جا کر بند در کھولنے لگا اور اُن میں وادیٔ سوات کے ایک سلیٹی منظر کی ہوائیں
لگیں۔

رات کی بارش نے پاپلر کے تنوں اور خالی شاخوں میں رچ رچ کر انہیں سیاہ کر دیا
ر وہ سلیٹی آسمان سے الگ کوئلے سے کھنچے ہوئے لگتے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب
رخت بہت دور تک جاتے تھے۔ اُن کی گاڑی بٹ خیلہ سے نکلی تو مشاہد نے کہا —
ہم اُس لینڈ سکیپ کو دیکھیں گے جس میں سلیٹی رنگ بہت ہے اور اُس میں صرف
ں کی کٹوریوں کی پیلاہٹ ہو گی جو الگ ہو گی۔ جونہی پاپلر کے ٹُنڈ مُنڈ درختوں میں
ی سڑک پر وہ آئے تو انہیں تین بچے دکھائی دیئے... اُن کے ہاتھوں میں نرگس کے
ا تھے جو وہ آس پاس کے کھیتوں میں سے جہاں وہ کہیں کہیں اِدھر گھاس میں اُدھر کسی
ل کے کنارے ان موسموں میں منہ نکالتے تھے چُن کر لائے تھے... نسان پٹرول اُن کے
ب ہوئی تو وہ جھجکتے ہوئے آگے ہوئے، متوقع سُرخ اور سرد چہروں کے ساتھ اور
وں کی کرختگی کے آثار لیے وہ نرگس کے پھول اُن کی ونڈ شیلڈ کے آگے پیلی کٹوریاں
سفید پنکھڑیاں لہرانے لگے۔

"روک لو —"

کالیے نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

مشاہد نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرنے کے بٹن پر ہتھیلی جما دی۔ نسان پٹر
ایک ہموار آہستگی سے...
منتظر ہوا کی یخ بستگی اور نرگس کی سرد مہک نے اس بار بھی اُسے اپنے
الگ کر دیا...
"یار اس بہن یا کھڑکی کو بند کرو سارا نشہ ہرن ہو رہا ہے — یہ نشہ ہرا
ہے؟... گدھا کیوں نہیں ہوتا — " کالیے نے اپنی ہپ فلاسک کے پیندے
ایک پوری تسلی کرنے والا گھونٹ بھرا۔ اور پھر ہرن اور گدھے کے حوالے سے
بے حد محظوظ ہوا جیسا کہ بلیک لیبل وہسکی کی تین چوتھائی بوتل پینے کے بعد انز
ہونے لگتا ہے۔ مشاہد باہر جا چکا تھا، سڑک کے کنارے وہ متعدد بچوں میں گھرا
ایک کو دس کا ایک ایک نوٹ دے کر اُن سے نرگس کے گچھے خرید رہا تھا۔
"بہن یا رومانٹک۔" کالیا بڑبڑایا اور ایک مست لہر کے ساتھ گاڑی
گیا۔ "بہن یا سردی — " وہ پھر کانپتے کانپتے بڑبڑایا "مجھے کوئی پرواہ نہیں ہو
کی سردی کی۔ لیکن یہ جو ہمارا یار ہے ڈاکٹر — اس کے غسل خانے اتنے ٹھ
ہیں کہ صبح ذرا کموڈ پر بیٹھو تو یار اپنچھی سارا دن سرد رہتی ہے اور اُس پر کموڈ کا
بنا رہتا ہے نیلے رنگ میں — کیوں؟" کالیا پھر محظوظ ہونے لگا اور مشاہد کے
کھڑا ہو گیا "ہاں جی... کہاں ہے ڈاکٹر — ؟"
ایک گرے منظر تھا — جس میں سب کچھ گرے کے مختلف شیڈز تھے
دسمبر کے سرد اور یخ سکوت میں ایک سڑک جس کے دونوں جا
کلومیٹر تک پاپلر کے خالی درخت سلیٹی آسمان پر اپنی شاخیں لکیرتے جا۔
راستے کے آس پاس دور تک خالی کھیت اور جہاں پہاڑیاں تھیں اُن کے سا
رنگ کے جنگل جن میں جاپانی پھل، بادام اور آڑو کے درخت جن پر ایک
تو جُدا ایسے موسموں میں ہوا جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں — اے ایذرا
درمیان دریائے سوات خاموشی سے بہتا تھا — اگر اُسے اِس دوری سے
خاموشی سے بہتا تھا۔ اور اُس پانی کا رنگ بھی گرے تھا۔
اور اس سلیٹی لینڈ سکیپ کی سردی میں جنگلی نرگس کی مہک —

برگیتا کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ کوئی بھی شخص صبح سے شام تک
ر کر کے مالاکنڈ پاس کو پار کر کے بٹ خیلہ کے آگے پاپلر سے گھرے ہوئے راستے پر چند
وں کے لیے صرف اس لیے جائے کہ وہاں ہر شے سلیٹی رنگ کی ہے اور وہاں سڑک
ے کنارے چھوٹے چھوٹے بچتے گورے بچے نرگس کے پھول ہاتھوں میں لیے منتظر ہوں
ے — اُن سے پھول خریدے، اپنی ولیز جیپ کی پچھلی نشست پر رکھے اور چند گھرے
انس لے کر آل دے دے واپس لاہور آ جائے — تقریباً چوبیس گھنٹے کی مسافت کے
د — برگیتا کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی برگیتا جو مشاہد کو سمجھتی تھی۔

چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں —

شکار، قادر آباد کے آس پاس — کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے
اوی اور وادیٔ سوات کا یہ منظر — یہ سلیٹی منظر — اور چوک چکلہ — لیکن یہ تو بعد
ں بلائے گا...

چار چیزیں ہیں —

درختوں کے ہاتھ خالی ہیں۔

"لیکن یار یہ بہن یا ڈاکٹر کہاں گیا۔ اوئے مشاہد یہ عمر ہے شادی کرانے کی —"
الیا یقیناً اپنے بدن میں حدت ہی حدت لہریں لیتی ہوئی وہسکی کی ترنگ میں تھا "اس عمر میں
ڑے کو تو بیوی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہاں محلے والوں کو ہوتا ہے۔"

مشاہد سے رہا نہ گیا اور وہ ہنسنے لگا "اوئے کالیے تو بکواس نہ کر۔"

"میں تو بچپن سے ہی بکواس کر رہا ہوں۔ میرے ابے نے مجھے ساتھ لگا لیا کہ بچو
ما برتنوں کا چھابا اٹھا کر چلتا جاتا ہوں اور تو وقفے وقفے کے ساتھ "آ بھانڈے لا — پتل
ے کٹورے، کٹوریاں تے تھالیاں لا — آ بھانڈے لا —" ذرا پکارتا چلا جا — اور
شاہدی تجھے رنگ محل مشن ہائی سکول کے زمانے یاد ہیں بہن یا — تو آگے آگے اور میں
ترے پیچھے پیچھے.. میں تجھ پر عاشق تھا۔ اے میرے پُت پینڈو میں تجھ پر عاشق تھا... قسم
سے تیرے ہڈ پیر مجھ سے مضبوط نہ ہوتے تو میں نے تجھے وَرت دینا تھا —"

"اوئے کالیے تو بکواس نہ کر یار —" مشاہد نے پھر کہا اور پھر ہنسا۔

"پتہ ہے میری قسمت کو کس نے جگایا اور جگا کر کہا اُٹھ پُتر کالا شاہ کاکو آ گیا
ے؟... گڑھی شاہو کی ایک دیسی میم نے۔ کہنے لگی، دیکھو تم پرانا پرانا برتن لاؤ ہم خریدتا

— لو جی.. اُن دنوں شہر لاہور میں پرانا پرانا برتن کا کوئی گھاٹا نہ تھا — ہم نے برتن
سیدھے گڑھی شاہو- پھر کام چل نکلا- بہت دنوں کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہم تو ایڈ
ہیں — آہو..." کالیے نے ہپ فلاسک نکالی اور اُس کی پشت پر تھپکی یوں د
نوزائیدہ بچے کو تھپکتے ہیں کہ فوراً سانس چلے اور رونا شروع کر دے لیکن کالیے
فلاسک جتنا رو سکتی تھی رو چکی تھی — "بہن یا ڈاکٹر کہاں ہے؟"

"چک درہ پل کے ادھر بائیں ہاتھ پر جو وے سائڈ ہوٹل ہے دریا کے
وہاں ہو گا —"

"میں تمہیں تجربے کی بات بتاتا ہوں مشاہدی —" کالیا بے حد ناراض
"اس عمر میں انسان شادی کرے تو محلے والے بہت فائدے میں رہتے ہیں اور میر
تجربہ ہے اے ڈارلنگ مشیل — جاپان اور امریکہ سے آتے ہیں تمہارے یہ میوزیم
اور کہتے ہیں مسٹر کالیا ذرا یہ پیس تو آتھنٹیکیٹ کر دو — تو میں اُس بُت کو یا
تمہارے وَرک آف آرٹ کو ذرا اس طرح چھوتا ہوں" کالیے نے اپنی ہتھیلی
فلاسک پر ایسے پھیرا جیسے وہ جسم رکھتی ہو "اور تجربے سے جان جاتا ہوں کہ یہ اصلی
نقلی — تو اسی طرح میں رَن کے جسم پر بھی ہاتھ پھیر کر جان جاتا ہوں کہ یہ رَن
یا نقلی مال ہے" کالیا پھر ہنسنے لگا..

"تو اپنے سامنے نہیں دیکھ رہا کالیے —"

کالیے نے سامنے دیکھا اور چُپ ہو گیا۔

یہ ایک عجیب سنگت تھی- عام بندے کی سمجھ میں نہ آنے والی — مشاہد
اپنے آپ میں گم سم رہنے والے کی دوستی کالیے کے ساتھ کس جذباتی سطح پر ممکن
شہر لاہور کی بوسیدہ ترین اور بھوکی گلیوں کا باسی، گندی نالیوں پر بیٹھ کر رفع حاجت
والا اور گلی گلی برتن بیچنے والے کا پانچواں بیٹا جس کی رنگت بہت سفید تھی اور اُس
صرف اس لیے کہ اُسے نظر نہ لگ جائے کالیا کہتی تھی، کیسے مشاہد کا دوست
چاہے وہ رنگ محل مشن ہائی سکول کے بنچوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوں اور ایک دو
کہتے ہوں کہ ذرا اپنی پُھلو تو دکھاؤ- صرف اس لیے کہ کالیے میں ایک حس تھی خو
اور شکل کی پہچان کی- وہ اکثر اوقات ایسی بات کہہ جاتا، کوئی کلمہ منہ سے نکالتا کہ
سناٹا چھا جاتا- وہ نوادرات کا پرانی اشیا کا بین الاقوامی سمگلر تھا — پوری دنیا میں کالیے

روشن تھا۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ سیکرٹری سطح کے بیوروکریٹس کو خوش کر کے اور انہیں اپنی لیوش پارٹیز میں مدعو کر کے نوادرات اور خاص طور پر گندھارا کو ملک سے باہر نقل کر دیتا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ایک کونیئر تھا — وہ کسی ہزاروں برس پرانے برتن یا مجسمے کو دیکھ کر کہیں اور چلا جاتا۔ اُس کی آواز بھرا جاتی اور اُنگلیاں لرزنے لگتیں اور وہ کہتا "جن بہن یا اُنگلیوں نے اِسے بنایا ہے میں صدقے اُن اُنگلیوں پر —"

کالیا بالکل چپ ہو گیا۔ چھوٹے قد کا، بے شمار بالوں کے جمگھٹ کا، چٹا گورا، اپنی عمر سے بہت کم دِکھتا کالیا چپ ہو گیا۔

"کالیے — چلیں؟"

"اب کیا چلیں؟ — اب میں نہیں جاتا۔ میں اِس بہن یا منظر کے اندر جا چکا ہوں واپس نہیں آ سکتا۔"

پاپلر کے کالے سیاہ درختوں کے نیچے کالیے کی نسان پٹرول کھڑی تھی۔ اور اس کرے اور سرد ہوا میں صرف نسان پٹرول کی شکل تھی جو قدرتی نہیں تھی۔ وہ ایک بدنما دھبہ لگ رہی تھی، سیاہ شاخوں کے جنگل، کھیتوں میں کہیں کہیں شکل دکھاتی سرد نرگس اور اس برفیلی کاٹ دار ہوا میں پارک کی گئی ایک بدنما دھبہ لگ رہی تھی۔

اُنہیں چلنا تھا اس لیے تھوڑی دیر بعد چلے اور تھوڑی دیر بعد چک درہ پُل کے اُدھر بائیں ہاتھ پر وے سائڈ ہوٹل سے پرے دریائے سوات کے بے دھوپ اور بے رنگ پانیوں کے کنارے اُنھوں نے پاپلر کے درختوں کی ٹہنیوں ایسے لچکتے پتلے دُبلے بدن والے ڈاکٹر ارشد کو سپاٹ کیا جس کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے وہ آل دے وے بٹ خیلہ آئے تھے اور بٹ خیلہ کے سول ہسپتال میں پہنچ کر اُنہیں معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اگرچہ کل بیاہ ہے لیکن وہ عادت سے مجبور اُس وے سائڈ ہوٹل کو جا چکے ہیں جو چک درہ پل کے ذرا اُدھر بائیں ہاتھ پر واقع ہے۔

ڈاکٹر ارشد نے انہیں دیکھ کر کوئی نمایاں مسرت کا اظہار نہ کیا۔ وہ اُس وقت پورے یقین میں تھا کہ دُکھتے ہوئے بازوؤں کے ساتھ یہ جو پانچ سو سترویں مرتبہ میں دریائے سوات کے گہرے پانیوں میں کاسٹ کر رہا ہوں تو بس ابھی اس بار میری ڈوری میں شدید کھچاؤ ہو گا اور ایک بھاری سِلور ٹراؤٹ اس بے رنگ اور بے دھوپ فضا کو چمکا دے گا..... وہ ڈوری لپیٹتا گیا جو بنا تناؤ کے آسانی سے چرخی پر لپٹتی گئی اور پھر خالی لشکتی دھات

والا بیٹ پانی سے باہر آ گیا۔

"برگیتا نہیں آئی؟" ڈاکٹر ایک ہپنوٹائزڈ سٹانس میں پانی کے بہاؤ پر نظریں اُسے تکے جا رہا تھا۔

"نہیں —" مشاہد نے جواب دیا۔

"بہن یا —" کالیے نے ہپ فلاسک کو ایک پتھر کی طرح ہتھیلی میں تولا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو جمانے کی کوشش میں اُسے پوری قوت سے گھما کر سوات کے پانیوں پر پھینکا۔ فلاسک ایک ٹھیکری کی طرح بہاؤ کے ساتھ ساتھ اچھلتی پھر نیچے چلی گئی "بہن یا ہم مہمان آئے ہیں اسلام آباد سے — خیر سے شادی کے کھانے آئے ہیں اور ہمیں کوئی بہن یا پوچھتا ہی نہیں —"

"ہیلو زاہد —" ڈاکٹر پہلی بار مسکرایا اور اُس کے چہرے پر کھنچی عمر کی دلکش نظر آنے لگیں۔

"زاہد لیکن زاہد خشک نہیں —" کالیے نے شہادت کی اُنگلی لہراتے ہوئے مرے دل کہیں اور چل کے انداز میں لہکتے ہوئے کہا۔

وے سائڈ ہوٹل کا ایک لڑکا دو کرسیاں اُٹھائے آ رہا تھا اور اُس کے پیچھے پیچھے کُتورا مکمل اطمینان سے شانت ہو کر اپنی ابتدائی دُم ہلاتا چلا آ رہا تھا۔

"اوئے —" کالیا چیخا "یہ وہی بہن یا کُتورا ہے جسے میں نے پچھلی مرتبہ پلیٹ میں سے گوشت کھلایا تھا۔ اپنی میز پر بٹھا کر۔ ایک طرف سے یہ کھاتا تھا اور دوسری طرف سے میں کھاتا تھا۔ ماشاء اللہ کیا قد نکالا ہے۔ اوئے برادرِ عزیز —" اُس کُتورے کے اوپر جھک کر اُسے خطاب کیا اور کُتورے نے فوراً پہچان کی چوں چوں ہوئے دُم پوری ناتواں قوت سے ہلانی شروع کر دی۔ کالیے نے برادرِ عزیز کو اُٹھا کر نم تھوتھنی کے متعدد بوسے لیے اور پھر احتیاط سے کسی مِنگ ڈائنسٹی کے قدیم گلدان احتیاط سے اُسے زمین پر رکھ دیا۔

وہ تینوں دریا کے کنارے رِکٹی، بہت مخدوش حال والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ قربت میں شور تھا اور ہوا زیادہ سرد تھی اور کانوں پر زیادہ اثر کرتی تھی۔

"وہ بدھا کے گریٹ ڈیپارچر والی فریز کہاں ہے ڈاکٹر؟" کالیے نے بیٹھتے ہی سوبر ہو کر کہا۔

بہت آسودگی سے اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر ارشد مسکرایا "تم سری بہلول گئے تھے —؟"

"ہاں —"

مردان تک زمین، درخت اور ہوا میں کچھ فرق نہ تھا۔ مردان سے نکلتے ہی جیسے زمین اور اس کے رنگ اور اس کی شکل بدلنے لگتی ہے۔ آلوچے کے درخت جن کی ٹہنیاں سیاہ اور گنجلک تھیں اور ان کے باغ دور تک، وہاں تک جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اُبھرتی تھیں۔ اور ایک عجیب ٹھہراؤ اور سکون جو ہزاروں برس پیشتر بدھ بھکشوؤں نے بھی اپنے دل کے اندر راہ بناتا ہوا محسوس کیا اور وہ یہاں سر جھکانے کے لیے ٹھہر گئے اور عبادت خانوں کی تعمیر کی — گندھارا کی لینڈ سکیپ میں چاہے وہ سوات میں تھی یا درہ خیبر کے آس پاس یا ٹیکسلا کے نواح میں، ہمیشہ ایک سرسبز میدان تھا جس میں کہیں کہیں پہاڑیاں سر اُٹھاتی تھیں اور یہاں ٹھہراؤ اور سکون کا احساس ذہن پر بیٹھتا چلا جاتا تھا۔

مردان سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تخت بائی سے پہلے بائیں ہاتھ پر گنے کے کھیتوں میں ایک راستہ نہر کے پار ہوتا تھا اور وہاں ایک بورڈ پر "سری بہلول" درج تھا۔ کالیے نے اپنی نسان پٹرول کے سٹیئرنگ کو یکدم ایسے گھمایا کہ دھول کا ایک بادل اس کے بڑے ٹائروں میں سے اُٹھ کر ونڈ شیلڈ کے آگے آگیا۔

مشاہد نے سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھا۔

ذرا کھسیانا ہو کر کالیا مسکرایا اور عینک درست کر کے کہنے لگا "تھوڑا سا بزنس۔"

مشاہد نے سامنے دیکھا اور ذرا سنبھل گیا۔ گنّے کے کھیتوں اور پاپلر کے درختوں سے پرے ایک پتھریلے اور کچے گھروں والا قصبہ گنّے کی ہریالی اور پاپلر کے بنا پتوں کی شاخوں میں سے جیسے اُبھرتا جا رہا تھا۔ ایک بہت بڑے ٹیلے پر وہ گاؤں تقریباً دو ہزار برس سے آرام کر رہا تھا۔ گندھارا کے قدیم نقشوں میں سری بہلول ایک اہم پڑاؤ تھا۔

گاؤں کے باہر گنّے کو پیڑنے کے لیے بیلنے لگے ہوئے تھے اور صحت مند بیل سر جھکائے خشک پرالی پر چکر کاٹتے تھے اور اپنے گلے میں لٹکتی گھنٹیوں کی آواز سے مسحور ہوتے ہوئے بے تکان چلتے جاتے تھے۔

حجام کی دوکان کے باہر چند غلیظ تولیے لٹک رہے تھے اور دھوپ سینکتے ہوئے

کمبلوں کی بُکلوں میں لپٹے چند پٹھانوں نے اپنی جانب آتی نسوان پٹرول کو دیکھ کر اندا
کہ بیوپاری آئے ہیں اور اُن میں سے جن کے پاس "گنّا" یا پتھر تھا وہ اپنے خیمے
ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے... ایک پتھریلی گلی کے کیچڑ میں سے زور لگاتی ہوئی پٹرول
ڈیرے کے قریب رُکی۔ اور پھر گیئر بدل کر ڈیرے کے اندر چلی گئی۔

ایک کچّا ڈیرہ جس کے صحن میں دو بڑی بڑی چارپائیاں تھیں اور دیوار پر تھو
پودے سجے تھے۔ دیوار سے پورا سری بہلول نظر آتا تھا اور تخت بائی کا علاقہ ایک
دُھند میں کچھ فاصلے پر تھا...

بُکل میں لپٹے لوگ آنے لگے۔ نوجوان بھی۔ عمر رسیدہ بھی اور چھوٹے چھ
بچے بھی... وہ کالیے کے سامنے آتے اور بُکل کھول کر اپنے ہاتھ آگے کر دیتے... ان
میں سری بہلول اور اس کے آس پاس سے ملنے والے گندھارا عہد کے ٹکڑے
مہاتما بدھ کے ٹوٹے ہوئے سر... قدیم گندھارن برتن۔ بدھ کی زندگی کے مختلف او
انگوٹھیاں... بیل بوٹوں والے پتھر...

سری بہلول گندھارا عہد کے مجسموں کی سپر مارکیٹ تھی۔

"بہن یا مجھے ٹوٹ پھوٹ نہیں چاہئے —" کالیے نے اُن سب کو ڈانٹا "میر
کالیا ہوں کنگ آف گندھارا، مجھے سالم پیس چاہئے — ہے یا نہیں؟"

ایک گدلے بھورے بالوں والا شخص جس کا نام سُور تھا آگے آیا "یارا تھا
اب نہیں۔"

"کونسا پیس تھا؟" کالیے کا رنگ زرد ہو گیا۔

"گریٹ ڈیپارچر تھا —" سُور کہنے لگا۔ اگرچہ وہ ان پڑھ تھا لیکن اس گاؤں
دیگر باسیوں کی طرح وہ جانتا تھا کہ گندھارا کے مجسمہ ساز مہاتما بدھ کی زندگی کے کون
سے ادوار پتھر میں سے تراشتے تھے اور اُن کو کس نام سے پکارا جاتا تھا۔

"ڈاکٹر تو نہیں آیا تھا؟" کالیے نے فوراً پوچھا۔

"آیا تھا —" سُور نے کالیے کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا تھا
لے گیا —"

وہ تینوں دریا کے کنارے رِکٹی، بہت مخدوش حال والی کرسیوں پر اپنے آ

بٹنکل بیلنس کر رہے تھے جب کالیے نے یکدم سوبر ہو کر پوچھا تھا کہ بدھا کے گریٹ ڈیپارچر والی فریز کہاں ہے ڈاکٹر — ؟

اور ڈاکٹر ارشد اس سوال کے جواب میں بہت آسودگی سے مسکراتا رہا۔

"بہن یا تمہارے کس کام کی ہے — تم بس اپنے کمرے میں سجا لو گے... مجھے بیچتے ہو... دو گنے پیسے دوں گا —"

"تم یہاں کاروبار کرنے آئے ہو؟ —" ڈاکٹر ارشد نے اُسے نہایت بے توقیر لہجے میں کہا اور ذرا غصے میں آ گیا "تمہاری ذہنیت نہیں بدلی۔ تم اب بھی ایک پھیری والے ہو برتن بیچنے والے۔ صرف نسان پٹرول پر بیٹھ کر پھیری لگاتے ہو۔ کبھی جاپان چلے جاتے ہو اور کبھی امریکہ — لیکن پھیری لگاتے ہو ڈیم اِٹ —"

کالیے نے اپنے سر کو متعدد بار جھٹکا اور پھر ایک شرمندہ کُتورے کی طرح سر جُھکا کر کہنے لگا "بہن یا نشہ زیادہ ہو گیا تھا اس لیے — سوری یار — بہن یا ہو جو اب بزنس کی بات کرے.. گندھارا۔ فک گندھارا یار — سوری یار۔"

"کوئی بات نہیں —" ڈاکٹر سب کچھ بھول گیا اور اپنے ان دو دوستوں کے چہروں کو اُلفت سے دیکھنے لگا جو اُس کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے اتنی دور سے آئے تھے۔

صرف پانچ برس پیشتر ڈاکٹر، مشاہد کو نہیں جانتا تھا۔

ایک شکار پر — قادر آباد کی جھیلوں پر ایک بہت سرد اور مائنس زیرو والی تاریک صبح کو اُن کی کشتی کے قریب سے ایک اور کشتی کُہرے کی برف کو شیشے کی طرح توڑتی ہوئی گذری تھی اور کالیے نے کہا تھا "اس میں میرا جماعتیا ہے مشاہد — اس میں زور بہت تھا نہیں تو میں نے اِسے وَرت دینا تھا —"

پھر وہ اکٹھے شکار پر جانے لگے اور اب — شائد وہ کالیے سے زیادہ اُس کے نزدیک اُس کے گہرے بھید کے نزدیک آ چکا تھا۔ مشاہد بھی دریا کے بہاؤ کو ایک ہپناٹائزڈ ٹرانس میں تکے جا رہا تھا۔ اُس نے گردن پھیر کر ڈاکٹر کی جانب دیکھا اور ڈاکٹر نے فوراً سر ہلایا۔ "شادی؟"

"ہاں" مشاہد نے بھی سر ہلایا۔

"کیا تم نے کبھی کسی مُردے کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا ہے؟"

"اوئے بہن یا مُردوں کی بات کرتے ہو دریائے سوات کے کنارے بیٹھ کر" کالیا

یکدم ہراساں ہو گیا "لو جی اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے مجھے ذرا طاقت چاہیے طاقت میری پٹرول میں پڑی ہے اور بلیک لیبل ہے —" وہ اٹھا اور اپنے آپ کو بچاتا ہوا سڑک کی جانب چل دیا۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے ایک سُریلی چاؤں چاؤں کُتورا بھی سَرہلاتا ہوا چلا گیا۔

"میں ایک فاصلے پر رہتا تھا — ہمیشہ۔ کبھی قبر کے قریب نہیں جاتا تھا۔ جب پڑ جاتی تھی تو ایک مٹھی میں بھی ڈالتا تھا اور قبرستان سے باہر آ کر دعا پڑھتا تھا اور چلا لیکن... پچھلے دنوں میں نے... ایک مقامی دوست کو قبر میں رکھا۔ اُس کے سفید کفن لپٹے ساکت اور بے بس جسم کو دیکھا۔ پھر میں نے اُس جسم کو بجری اور سیمنٹ سے سلوں کے پیچھے کٹ کٹ کر غائب ہوتے دیکھا۔ میں موت سے خائف تو نہیں ہوا زندگی کے اکلاپے سے یکدم خوفزدہ ہو گیا... چنانچہ میں نے اس عمر میں بھی — شا فیصلہ کر لیا۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی — تدفین کے اگلے روز میں نے ایک دمے کے مریض سے با جو صرف ایک مرتبہ اپنی بیٹی کے ہمراہ آیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک مختصر سا خاکہ ایک واضح سی شکل اُس کی بیٹی کی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا اُس کی بیٹی کی شادی ہے تو اُس نے جواب میں اپنی غربت کے بارے میں کچھ کہا... بیٹی کی عمر زیادہ ہو جا بارے میں کچھ کہا تو میں نے صرف اتنا کہا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور — وہ لڑکی کچھ پڑھی لکھی ہے؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ... اس علاقے میں لڑکی پڑھی لکھی ہو ہی سکتی۔"

"ارشد — تم۔"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ بٹ خیلہ سول ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں جو گھر ہوا ہے... اُس میں کوئی اور بھی ہو — کوئی بھی — میں اب اکیلا نہیں رہ سکتا۔"

اُس کے پیچھے چھوٹا کُتورا سَرہلاتا آ رہا تھا اور آگے آگے کالیا تھا اور اُس کے میں جانی واکر کی ایک بلیک لیبل بوتل تھی۔ "لو جی ڈاکٹر صاحب — اب کرو مُردوں بات۔" اُس نے بوتل سے براہ راست ایک ڈیک لگائی اور سر جھٹک کر مسکرا

کوشش کرنے لگا۔ اور اس کوشش میں اُس کی ناک کچھ زیادہ ہی سُرخ ہو گئی اور اُس کی شکل انتہائی حماقت آمیز اور بیہودہ سی ہو گئی۔

"اب کرو مُردے کو قبر میں... اُتارنے والی بات۔ زاہد کالیا تیار ہے لبالب..."

مشاہد نے ہاتھ آگے کر کے کالیے کے ہاتھوں میں بھنچی ہوئی بوتل پر رکھا تو اُس نے فوراً گرفت ڈھیلی کر دی "ابھی تم نہیں پیو گے —" آواز میں اتھارٹی تھی۔

"یس باس۔" کالیے نے کرسی سے اُٹھ کر مشاہد کو سیلوٹ کیا اور کرسی پر بیٹھنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچا۔

"اب یہ میرے پاس رہے گی —"

"یس باس۔" کالیے نے وقت ضائع کیے بغیر کھڑے ہو کر ایک اور زور دار سیلوٹ مارا اور اُسی حالت میں کھڑا رہا۔

"بیٹھتے کیوں نہیں؟"

"باس یہ تمہارے پاس رہے گی لیکن پٹرول میں جو بہن یا تین بوتلیں اور ہیں وہ کس کے پاس رہیں گی؟"

دونوں نے اُسے دیکھا۔ کالیا دریا کی ٹھنڈک میں ہولے ہولے لرز رہا تھا اور ابھی تک سیلوٹ کی حالت میں تھا اور دور کہیں افق پر نظریں جمائے بت بنا کھڑا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زاہد کالیا اب پہنچ چکا ہے اور جب وہ پہنچ چکا ہے تو پھر اسی حالت میں صبح تک کھڑا رہے گا بیٹھے گا نہیں — جب تک کہ اُسے زبردستی نہ بٹھایا جائے چنانچہ ان دونوں نے مسکراتے ہوئے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور زبردستی بٹھا دیا۔

"باس۔" وہ ابھی بٹھایا ہی گیا تھا کہ ایک سپرنگ کی طرح پھر اُٹھ کھڑا ہوا "بہن یا چل —" اُس نے دریا کے پار چک ورّے کی جانب اشارہ کیا۔ وہاں ابھی دھوپ تھی ریہاڑی کی چوٹی کے قریب ایک بیرک نما عمارت کے نیچے چونے سے "چرچل پوسٹ" لکھے بڑے حرفوں میں لکھا گیا تھا کہ ورلڈ وار ٹو کی کسی فلم کا اشتہار لگتا تھا۔ وہ دونوں دوبارہ ہنسے اور اب قدرے ناگواری سے کالیے کو زبردستی اُس کی کرسی پر براجمان کیا "اب اگر ہماری پشت نے اس کرسی کی پشت کو چھوڑا تو میں یہ بوتل توڑ دوں گا —"

"ویسے تو تین اور بھی ہیں باس —" کالیا جیسے پہلے اداکاری کر رہا تھا، صرف اپنے باس کو خوش کرنے کے لیے، اب نارمل ہو گیا "لیکن اب نہیں اُٹھوں گا۔ پر ایک شرط